غالب کی دُشنام طرازی

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور

Abstract

This was Mirza Ghalib's unique ability that he presented even traditional themes in his own modern style. In this article, it is discussed that Ghalib reacts in his Ghazal in a very strict diction against those factors or people who discourge, exploite, ignore or humiliate him. He speaks in a loud voice weather the opposisition is his beloved, ruler, society or literary enemies.

میرزا ہرگوپال تفتہ غالب کے عزیز شاگردوں اور دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ غالب کے سب سے زیادہ خطوط (۱۲۳) انھی کے نام ملتے ہیں۔ تفتہ اگرچہ فارسی زبان کے شاعر تھے، چند تحریریں اردو میں بھی لکھیں لیکن حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ زندہ وہ محض غالب کی شاگردی کی وجہ سے رہیں گے یا اس قطعے کی بنا پر جو انھوں نے غالب کی وفات پر لکھا۔ قطعہ ہے:

غالب وہ شخص تھا ہمہ دان جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حُسن و عشق
چھے لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

غالب نے اپنے عہد کی بے توقیری اور ناقدری سے تنگ آ کے کہا تھا:

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

لیکن ہمیں یاد ہے کہ اسی شاعرِ بے مثال کے دوسویں جنم کے حوالے سے ہونے والی تقریبات میں نئے زمانے کے اہم شاعر جناب جعفر بلوچ نے اپنے عہد کی نمایندگی کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ:

غالب خستہ کے بغیر سارے ہی کام بند ہیں
روئیے زار زار بھی اور کیجیے ہائے ہائے بھی

جعفر بلوچ کی یہ بات کئی حوالوں سے سچ ثابت ہوتی ہے کہ آج غالب کی وفات کو بھی ڈیڑھ صدی ہونے

کو آئی ہے، اب تک غالب کی حیات اور فن کے کتنے ہی پہلو ہیں، جن سے غالب شناسوں نے حتّی کہ غالب شکنوں نے ہمیں متعارف کروایا ہے۔ اسے غالب کی رنگارنگی یا متلوّن مزاجی کہیے یا غالب شناسوں کی نکتہ چینی وشیوہ بیانی کہ آئے دن غالب کی زندگی کا کوئی نہ کوئی نیا گوشہ سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ کہیں غالب کے کلامِ نظم ونثر میں ان کی ذاتی زندگی منعکس ہوتی نظر آتی ہے، کہیں برصغیر کی سیاسی وی سماجی تاریخ ہاتھ باندھے کھڑی دکھائی دیتی ہے، کہیں طنز وظرافت کے بے قرار گوشے انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور کہیں ان کے خطوط کے مطالعے کے دوران نئی نئی ادبی اصناف کی بازگشت سنائی بلکہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھر غالب کے مزاج سے آشنا لوگ جانتے ہیں کہ ان کے کلام کی طرح ان کی شخصیت میں بھی گنگا جمنی کیفیت پائی جاتی تھی۔ ان کی اعلیٰ ظرفی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایک طرف وہ محبوب کے منھ سے نکلنے والی گالیوں پہ بھی دل وجاں سے نثار:

؎ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا　　اور

؎ بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں [۱]

اور دوسری جانب خود کو گالیاں دینے والوں کے جواب میں نہ صرف قہقہے لگاتا دکھائی دیتا ہے بلکہ ان کی گرامر بھی درست کرتا نظر آتا ہے کہ بوڑھے آدمی کو ماں بہن کی نہیں بیٹی کی گالی دی جاتی ہے۔ لفظ گالی جو ہندی الاصل ہے۔ اس کا فارسی متبادل دشنام اور مفہوم بدزبانی، بری اور فحش بات کے ہیں۔ یہ اپنی بری شہرت کے باوجود دنیا کی ہر تہذیب کے قدم سے قدم ملا کر چلتی آئی ہے۔ اگرچہ ہر سوسائٹی بالاتفاق اسے برا سمجھتی ہے، بقول معروف:

؎ گالی کو جانتا ہے سارا جہان گندی
مت لا زباں پہ گالی ہو گی زباں گندی [۲]

لیکن اس کے باوجود یہ ہر معاشرے میں سینہ بہ سینہ بلکہ منھ بہ منھ چلی آئی ہے بلکہ بے تکلف دوستو اور سہیلیوں کی محافل میں تو اسے بے تکلفی اور اخلاص کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے، بقول میر حسن:

؎ کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں [۳]

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی خودنوشت میں ایک ایسے دفتر کا نقشہ کھینچا ہے، جہاں مختلف تہذیبوں کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کا مزاج، تربیت، ترجیحات سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن اس عادت بد کے سلسلے میں سب کا اندازہ یکساں ہے، لکھتے ہیں:

''بنک میں لکھتے سب انگریز، بولتے اردو لیکن گالی ہمیشہ مادری زبان میں دینا پسند کرتے تھے .....زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے۔'' [۴]

جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے، اس میں جرأت، انشا اور مصحفی تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ قلم

مناقشوں پہ یقین رکھتے تھے اور ان کے ہاں اکثر و بیشتر اس طرح کا انداز ملتا ہے کہ:

؎ بات کرتے ہی سنائی ہمیں گالی کیا خوب
چال صاحب نے نئی یہ تو نکالی کیا خوب　　مصحفی

؎ آئینے کی گر سیر کرے واعظ تو دیکھے
منھ خوک کا سر خوس کا لنگور کی گردن　　(انشا)

لیکن جہاں شاعرِ مشرق اور مدبر زمیندار جیسے ثقہ اور نستعلیق بزرگ اور مصلحینِ قوم بھی یہ انداز اختیار کرتے نظر آئیں کہ:

؎ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے　　(اقبال)

؎ نئی تہذیب کے منھ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرام زادی کا حلیہ بگاڑ دے　　(ظفر علی خاں)

؎ حیرت سے تک رہی ہے شریفوں کی آبرو
ڈھالے ہیں سیم و زر نے کمینے نئے نئے　　(ایضاً)

تو سمجھ لیجیے کہ حالات و واقعات ان کی توقع اور برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔ اس طرح میرزا غالب بھی اپنی ذات کے سامنے میں تو برداشت اور زندہ دلی کی آخری حد تک جانے کو تیار ہیں، لیکن یہی زندہ دل اور وسیع مشرب غالب جب کسی کو شعر و ادب کے میدان میں کج روی یا دھونس دھاندلی کا مرتکب دیکھتا ہے تو ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے اور اپنا احتجاج کٹیلے جملوں، شوخ پھبتیوں، دبنگ تبصروں، حتّی کہ ہلکی پھلکی گالیوں کی صورت فوری ریکارڈ کروا دیتا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک بار جب کسی جاننے والے نے میر اسدامانی کے اس شعر:

؎ اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی　　۵

کو غالب سے منسوب کیا تو نہ صرف آیندہ سے تخلص بدل لیا بلکہ برملا اس بات کا بھی اظہار کیا کہ اگر تو یہ شعر کسی اور اسدؔ کا ہے تو اس پر واقعی خدا کی رحمت ہو، اور اگر یہ مجھ اسدؔ کا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

ذرا اس تیس سالہ غالب کی تنک مزاجی کا اندازہ لگائیے جو مالی حالات سے پریشان ہو کر پنشن کی بحالی کے سلسلے میں دہلی سے کلکتہ کا سفر کرتا ہے۔ وہ کلکتہ کہ جہاں کی ادبی دنیا میں مرزا قتیلؔ اور واقفؔ کی استادی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ غالب وہاں پردیسی ہیچ، پریشاں حال ہے، بے یارومددگار ہے لیکن وہاں جوں ہی میرزا قتیل کی پیروی یا تقلید کی بات چلتی ہے تو وہ اس کے جملہ عقیدت مندوں کے سامنے اسے اس انداز سے ''کھتری بچہ'' کہتا ہے کہ جس کا سیدھا سیدھا مفہوم ''اُلّو کا پٹھہ'' نکلتا ہے۔ وہیں یہ شعر بھی کہتا ہے کہ:

ے　زلّہ　بردار　کس　چرا　باشم
من　ہمایم　مگس　چرا　باشم

وہ شخص جو وظیفہ لیٹ ہو جانے پر اپنے مربیوں کو خاندانی تاریخ تبدیل کرنے کی دھمکی لگا دیتا ہے؛ دہلی کالج کے پرنسپل کے روزانہ دروازے پر آ کے استقبال نہ کرنے کو بدتہذیبی پہ محمول کرتا ہو، جس کی اپنے بارے میں سخن گستری کا یہ عالم ہو:

ے　چاہتے　ہیں　خوب　روؤں　کو　اسدؔ
آپ　کو　صورت　تو　دیکھا　چاہیے!!!

حتّٰی کہ جس کی اللہ تعالیٰ سے بے تکلفی کی سرحد قدم قدم پہ گستاخی سے جا ملتی ہو، وہ دوسروں کے ساتھ کیا کیا بد دماغی روا رکھتا ہو گا، آیئے اس کے خطوط کے آئینے میں دیکھتے ہیں:

آخری عمر میں میرزا کی مقبولیت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور ان کا کلام گلیوں بازاروں میں گایا جانے لگا تھا۔ بعض موقع پرست اس میں الحاقی کلام بھی شامل کر دیتے تھے۔ علاؤالدین علائی نے کسی ایسی ہی غزل کی طرف توجہ دلائی تو جواب میں ان کو لکھتے ہیں:

''اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔''[۶]

اسی طرح علاؤالدین علائی نے حافظ اور خسرو سے منسوب دو فارسی غزلوں پہ وضاحت چاہی تو ایک مشترکہ میرزا شہاب الدین ثاقب کے نام لکھتے ہیں:

''تم علاؤالدین خاں کو لکھو کہ بڑے شرم کی بات ہے:

ع　ہر　دم　آزردگی　غیر　سبب　راچہ　علاج

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو؟ واہ واہ ''غیر سبب'' یہ کہاں کی بولی ہے؟

ع　از　خواندن　قُران　تو　قاری　چہ　فائدہ؟

عیاذاً باللہ امیر خسرو ''قرآن'' کو ''قُران'' بروزنِ ''پُران'' لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں ''حافظ'' اور ایک نے مقطع میں ''خسرو'' لکھ دیا ہو۔''[۷]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا میرزا غالب اپنی ذات کے حوالے سے بہت کچھ برداشت کر جاتے تھے لیکن علم و ادب کے کچے کو معاف نہیں کرتے تھے۔ اس کا خوب نوٹس لیتے تھے بلکہ بعض اوقات تو انداز اس طرح کا ہوتا تھا:

''میں'' ''برہانِ قاطع'' کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ ''چار شربت'' اور ''غایث الغات'' کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔''[۸]

میرزا غالب جیسا روایت شکن شاید اردو ادب میں کوئی دوسرا ہو۔ وہ نہ صرف بندھی ٹکی روایات مذاق اڑاتا

ہے بلکہ ریکارڈ کی درستی کے لیے خطائے بزرگاں گرفتن کی خطا نہیں بلکہ اپنی علمی برتری گردانتا ہے میرزا تفتہ کے ساتھ ایک اور بحث میں میرزا کا موقف ملاحظہ ہو:

> ''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟ .....سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگس عبدالواسع ہانوی، لفظ ''نامراد'' کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل، مغوث کدہ، شفقت کدہ، نشتر کدہ، ہمہ عالم اور ہمہ جا کو غلط کہتا ہے۔''۹

غالب کی زندگی میں آنے والے اور دکھ ہی کیا کم تھے، غمِ روزگاری، غمِ اولاد، پنشن کا غم، ناقدری کا غم، ان پر مستزاد دیوان کا ڈھنگ سے نہ چھپنا، چنانچہ میر مہدی مجروح کے نام لکھتے ہیں:

> ''دیوانِ اُردو چھپ چکا ہے۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دِلّی پر اور اس کے پانی اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔''۱۰

پبلشر کے اس غیر سنجیدہ رویے اور ناجربہ کاری کا تذکرہ وہ قبل ازیں نواب میاں داد خاں سیاح کے نام لکھے خط میں بھی ان سخت الفاظ میں کر چکے تھے:

> ''دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا، موسوم بہ عظیم الدین، جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں بھوت ہے، پلید ہے، غول، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔''۱۱

صاحبِ عالم مارہروی جو مارہرہ میں ''سرکار خورد'' کے سجادہ نشین تھے، غالب کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ وہ عمر میں غالب سے ایک برس بڑے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک بار انھوں نے غالب کو لکھا تھا کہ لفظ ''تاریخ'' میرا سالِ ولادت (۱۲۱۱ھ) ہے۔ غالبؔ نے ان کو مزاحاً یہ شعر لکھ بھیجا:

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا
ان کی ''تاریخ'' میرا ''تاریخا''

اس میں یہی نقطہ پوشیدہ ہے کہ ''تاریخ'' میں الف کا ایک عدد بڑھ جائے تو غالب کا سالِ ولادت (۱۲۱۲ھ) نکل آتا ہے۔ صاحبِ عالم کے ساتھ میرزا غالب کی لسانی بحثیں چلتی رہتی تھیں۔ انھوں نے ایک خط میں ہندوستان کے نام نہاد فارسی دانوں کی آڑ لی تو غالب نے ان کا اس طرح ناطقہ بند کیا:

> ''وہ میاں ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے، جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ: ''بے مراد'' صحی اور ''نامراد'' غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے۔ ''بے مراد'' اور ''نامراد'' میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ ''نامراد'' وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد، کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ ''بے مراد'' وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سے سادہ ہو..... اصل فارسی کو اس

''کھتری بچے'' قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں؟ جو صاحبِ عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں؟ خالصاً لِلّٰہ غور کرو کہ وہ خرانِ نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللّٰہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی شعر جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوتِ ممیزّہ سے کام لو، ان غزلوں پر لعنت کرو، سیدھی راہ پ آ جاؤ، اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمھاری بزرگی پر اور میرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو، مگر اس کھتری بچے اور اس معلم سے مجھ کو کم تر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو، تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ، غور کرو۔ سمجھو، عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں، مانتے ہو مانو، نہ مانو تم جانو۔'' ۱۲؎

غالب کے ہاں لوگوں کا احترام دو وجوہات کی بنا پر دیکھنے میں آتا ہے۔ علمی مرتبے کینا پر یا کسی مالی مجبوری کے پیشِ نظر۔ بناوٹی لوگ ہمیشہان کی طنز اور تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کردار کا تذکرہ دیکھیے:

''صبح کو بھائی فضلو، جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدولہ خطاب دیا ہے ..... خدا کی قسم تامس ہُدرلے صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں الک صاحب سے ہے۔ سوان کے نام کا خط لکھا ہوا تمھیں بھیجتا ہوں۔ پڑھ کر، بند کر کران کو دو اور ان سے ملو اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔ احتلام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کہ کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کس ہتھیار کا نام اور سکندر شاہ کون سے درخت کا پھل ہے؟'' ۱۳؎

میرزا غالب کا بچپن نہایت ناز و نعم میں گزرا تھا۔ باپ اور چچا کی بعجلت مدت کے بعد ان کی دس ہزار سالانہ پنشن مقرر ہوئی، جو ریاست فیروز پور جھرکہ کی وساطت سے ملنا تھی۔ لیکن والیان ریاست کی بدنیتی سے اس میں تخفیف اور بے قاعدگی آتی گئی۔ اس میں کئی طرح کے حصے دار پیدا کر دیے گئے اور غالب کے حصے میں محض باسٹھ روپے ماہوار رہ گئے۔ غالب نے اصل پنشن بحال کرانے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی اور خلافِ مزاج حاکموں کی منت خوشامد بھی کی، لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ انھی کے بقول:

؎ فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

پھر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اس زمانے میں کلکتہ نئی تہذیب اور علم و ادب کا مرکز تھا۔ غالب نے وہاں غریب الوطنی کے باوصف ایک طرف مرزا قتیل اور واقف جیسے مقبول عالم شعرا کے حواریوں سے مناقشہ شروع کر رکھا ہے اور دوسری جانب پنشن کی مقدمہ بازی چل رہی ہے۔ جب امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی تو نواب حسین مرزا کے نام خط میں لکھا:

''کہیں جواب صاف مل چکے تو اس شہر سے چلا جاؤں۔ یہ دو روپے روز بھی اس غاصب ملعون کی گور میں جائیں، جس نے مجھے دس ہزار روپے سال میں سے یہ کچھ دیا ہے۔ علیہ اللعنت والعذاب۔'' ۱۴

میرزا غالب کی تحریروں میں دشنام طرازی کا یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے نام لکھے خطوط میں مختلف کرداروں اور رویوں کے بارے میں دل کی بھڑاس نکالتے چلے جاتے ہیں بلکہ کبھی تو اپنا ہدف آپ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی کیفیات کی چند مزید مثالیں دیکھیے:

''خیر، اب جو میں بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو۔'' ۱۵

''حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بے ہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلطِ محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو۔'' ۱۶

''یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے، اس پر حمزہ لکھتا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔'' ۱۷

''میں نے اس کو ''دوست'' بطریقِ طنز لکھا ہے۔ بہرحال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا، اس کی ماں مرے، اگر اس نے میرے خط کا جواب لکھا ہو۔'' ۱۸

''زمان'' لفظ عربی ''ازمنہ'' جمع، دونوں طرح فارسی میں مستعمل۔ ''زمانے''، یک زماں''، ''ہرزماں''، ''زماں زماں''، دریں زماں'' ''دراں نے ماں'' سب صحیح اور صحیح، جو اس کو غلط کہے وہ گدھا۔'' ۱۹

''اگر وہ ناصر دبے درد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔'' ۲۰

''اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں، ہندوؤں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں؟ گائے کا بچہ بہ زورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو۔'' ۲۱

''بھلا میرے کلام کو گوزِ شتر سمجھتے ہو؟'' ۲۲

''جب اہلِ شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟'' ۲۳

''اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو تو تم کو آفریں۔'' ۲۴

سب جانتے ہیں کہ غالب اپنے عہد کا سب سے جدید اور زندہ دل شخص تھا۔ غمِ زمانے اور غمِ روزگار نے اسے پیس کر رکھ دیا لیکن اس نے اپنی انفرادیت پہ آنچ نہیں آنے دی۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا کہ غالب کو اگر اس

کے عہد کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اسے اتنا جدید ہونے کی جرأت کیسے ہوئی جب کہ اسے اس عہد میں زندہ بھی رہنا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ روایت سے انحراف کسی بھی معاشرے میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ غالبؔ کی تو ساری عمر ہی روایت شکنی اور معمول گریزی میں گزر گئی۔ اس کو اس کا خواب خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ اس کے باوجود وہ اپنے عمل پہ ہمیشہ متفخر و مستعد نظر آیا:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

غالب کو اپنی اس جدّت، حدّت اور شدّت کی یہ قیمت ادا کرنا پڑی کہ وہ اپنے ہی عہد ناسپاس میں اجنبی بن کر رہ گیا۔ روایت پرستوں نے اسے چیستاں، زمانہ سازوں نے کیستاں اور حاسدوں نے نیستاں قرار دیا۔ اسے اپنے عہد کے اعصاب پر سوار ہونا تھا لیکن اس کا کلام لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ یہی ناقدریٔ زمانہ اور بے مہریٔ یاراں اس کی زندہ دلی اور آزادہ روی سے بار بار ٹکراتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں کہیں کہیں طعنوں، مہنوں، بددعاؤں اور گالیوں کی چنگاریاں بھی برآمد ہوتی رہیں۔ میرزا غالب کے اس بہتّر سالہ المیے کو اگر اختصار کے آئینے میں دیکھنا ہو تو میرزا قربان علی بیگ سالک کے نام لکھے گئے اس خط کو سامنے رکھا جا سکتا ہے:

''میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ ۲۵ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ وقدعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کامزمرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ''جنت آرام گاہ'' و ''عرش نشین'' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلم روِ سخن جانتا تھا، ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آیئے نجم الدولہ بہادر'' ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں: ''اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے؟ اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو؟'' بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے ''آم'' مترادف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا؟''[۲۶]

حواشی:

۱۔ دیوان غالب، المسلم پبلشرز کراچی، ۱۹۸۹ء دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۵۲، ؟
۲۔ بحوالہ فرہنگ آصفیہ، مرتبہ: سید احمد دہلوی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء (بار ششم)
۳۔ میر حسن، سحر البیان، ادارہ بزمِ خضرِ راہ، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۴۹
۴۔ مشتاق احمد یوسفی، زرگزشت، دانیال، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۸۰
۵۔ خط نمبر ۲۰ بنام: منشی شیونرائن آرام، خطوطِ غالب (مرتبہ: غلام رسول مہر) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
۶۔ خط نمبر ۲۳ بنام: علاؤ الدین خاں علائی، خطوطِ غالب ص: ۷۰/س ن، ص: ۲۱۳
۷۔ خط نمبر ۶ بنام: میرزا شہاب الدین ثاقب، خطوطِ غالب ص: ۹۴
۸۔ خط نمبر ۹۰ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۶۱
۹۔ خط نمبر ۲۳ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۶۲-۱۶۶
۱۰۔ خط نمبر ۳۷ بنام: میر مہدی مجروح، خطوطِ غالب ص: ۲۵۵
۱۱۔ خط نمبر ۱ بنام: میاں دادخاں سیّاح، خطوطِ غالب ص: ۳۶۴
۱۲۔ خط نمبر ۲ بنام: صاحبِ عالم مارہروی، خطوطِ غالب ص: ۴۲۹-۴۳۰
۱۳۔ خط نمبر ۱۰، ۱۱ بنام: نواب یوسف میرزا، خطوطِ غالب ص: ۳۴۶، ۳۴۷
۱۴۔ خط نمبر ۱ بنام: نواب حسین میرزا، خطوطِ غالب ص: ۳۳۰
۱۵۔ خط نمبر ۴ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۰۵
۱۶۔ خط نمبر ۲۱ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۱۸-۱۱۹
۱۷۔ خط نمبر ۲۲ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۱۹
۱۸۔ خط نمبر ۸۸ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۵۹
۱۹۔ خط نمبر ۹۴ بنام: علاؤ الدین خاں علائی، خطوطِ غالب ص: ۱۶۳
۲۰۔ خط نمبر ۹۹ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، خطوطِ غالب ص: ۱۶۶
۲۱۔ خط نمبر ۱۱۵ بنام: علاؤ الدین خاں علائی، خطوطِ غالب ص: ۱۷۴
۲۲۔ خط نمبر ۱۱۶ بنام: علاؤ الدین خاں علائی، خطوطِ غالب ص: ۱۷۵
۲۳۔ خط نمبر ۴ بنام: نواب یوسف میرزا، خطوطِ غالب ص: ۳۴۰
۲۴۔ خط نمبر ۱ بنام: تفضّل حسین خاں، خطوطِ غالب ص: ۳۶۳
۲۵۔ یہاں چچا سے مراد خود میرزا غالب ہیں، جو سالک کو اپنا بھتیجا سمجھتے ہیں اور خود اپنے دگرگوں معاشی معاشرتی حالات کی بنا پر موت کے قریب
۲۶۔ خط نمبر ۱ بنام میرزا قربان علی بیگ سالک، خطوطِ غالب، ص: ۹۶